10

دین کے لیے زندگی وقف کرنے کی تحریک کو جماعت میں کس طرح کامیاب بنایا جائے

بعض دوستوں کی اہم تجاویز

(فرمودہ 9 مارچ 1956ء بمقام ربوہ)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''وقفِ زندگی کے متعلق جو خطبات میں نے پڑھے ہیں اور اخبار میں شائع ہوئے ہیں اُن پر باہر کے لوگوں کو بھی غور کرنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ متعدد دوستوں کی طرف سے مجھے خطوط آئے ہیں جن میں انہوں نے بعض تجاویز لکھی ہیں۔ ان تجاویز میں سے بعض تو معقول ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کا ذکر میرے گزشتہ خطبات میں بھی آ چکا ہے۔ اور بعض ایسی ہیں جو اظہارِ جوش اور فکر پر تو دلالت کرتی ہیں لیکن وہ قابلِ عمل نہیں ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جو درست ہی نہیں۔ بہرحال ان خطوط میں سے میں نے بعض امور نوٹ کیے ہیں تا کہ دوستوں کے سامنے اُن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔ اب میں اختصاراً اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

ایک دوست نے لکھا ہے کہ بچوں کو بچپن سے ہی اِس امر کی طرف توجہ دلانی چاہیے کہ انہوں نے بڑے ہو کر دین کی خدمت کرنی ہے اور اس غرض کے لیے ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ بچپن سے ہی بچوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے رہیں کہ بڑے ہو کر انہوں نے دین کا خادم بننا ہے۔ میرے نزدیک ان کی یہ بات بالکل درست ہے اور اِس پر دوستوں کو عمل کرنا چاہیے۔ اس نوجوان نے اپنا تجربہ لکھا ہے کہ میں چھوٹا تھا تو میرے ماں باپ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم اس انتظار میں ہیں کہ تُو پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے۔ میرے کان میں متواتر یہ بات پڑتی رہی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں بڑا ہوا، اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور میں ملازمت کے لیے کراچی پہنچ گیا۔ اب دین کی خدمت کا خیال آتا ہے تو ساتھ ہی افسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال اُس وقت کیوں نہ آیا جب میں دین کی خدمت کے لیے مفید وجود ہوسکتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ اِس وجہ سے ہوا کہ میرے والدین نے بچپن سے ہی میرے کانوں میں یہ بات ڈالی تھی کہ میں نے بڑے ہو کر افسر بننا ہے۔ انہوں نے یہ بات میرے کانوں میں نہ ڈالی کہ میں نے بڑے ہو کر دین کی خدمت کرنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماں باپ کی تعلیم بڑے بھاری نتائج پیدا کرتی ہے۔

مثل مشہور ہے کہ کوئی چور تھا۔ وہ چوری کے لیے کسی گھر میں گیا۔ اتفاقاً گھر والے جاگ رہے تھے۔ انہوں نے اُس چور کو گھیر لیا۔ چور کو ڈر پیدا ہوا کہ اگر میں پکڑا گیا تو مجھے جیل خانہ میں بھیج دیا جائے گا اور عدالت سے مجھے سزا ملے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ محفوظ نکل جانے کی کوئی صورت پیدا کروں۔ چنانچہ اُس نے گھر والوں سے لڑائی شروع کر دی جس میں ایک آدمی مارا گیا۔ آخر وہ پکڑ لیا گیا اور عدالت سے اُسے پھانسی کی سزا ملی۔ عام طور پر مشہور ہے معلوم نہیں ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں کہ جیل خانہ کا یہ قاعدہ ہے یا کسی زمانہ میں قاعدہ ہوا کرتا تھا کہ جب کسی کی پھانسی کا وقت قریب آئے تو جیل کے ملازم اُس سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر کوئی خواہش ہو تو وہ بیان کر دے۔ اگر وہ خواہش قانون کے لحاظ سے جائز ہوتی تو وہ اسے پورا کر دیتے۔ اِسی دستور کے ماتحت اُس چور سے بھی دریافت کیا گیا کہ اس کی کوئی خواہش ہو تو بیان کر دے۔ اُس نے کہا میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ جیل خانہ والوں نے اس کی

ماں کو بلایا اور اس کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ اس نے کہا میں نے اپنی ماں کو علیحدگی میں ملنا ہے۔ چنانچہ پردہ ڈال دیا گیا تا وہ اپنی ماں سے علیحدگی میں بات کر لے۔ جب اس کی ماں اُس سے علیحدگی میں ملنے کے لیے گئی تو اُس نے کہا میں تمہارے کان میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس نے اپنا کان اس کی طرف کر دیا۔ اُس کا اس طرف کان جھکانا تھا کہ یکدم وہ چیخنے لگ گئی اور اس نے کہنا شروع کر دیا ہائے! میں مرگئی۔ ہائے! میں مرگئی۔ پولیس نے آواز سنی تو وہ دوڑ کر اندر آئی اور اس نے دیکھا کہ اس نے اپنی ماں کا کان دانتوں سے کاٹ لیا ہے اور اس کا تمام جسم اور کپڑے خون سے لت پت ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر پولیس کے آدمیوں نے اسے ملامت کی اور کہا کہ تجھ سے بڑا ظالم اَور کون ہو گا کہ تُو نے موت کے وقت اپنی والدہ سے اتنی ظالمانہ حرکت کی۔ پھر اگر پھانسی سے بڑھ کر کوئی اَور سزا ہوتی تو تم اس کے قابل تھے۔ اِس پر اُس نے کہا تمہیں کیا پتا؟ پھانسی کی سزا دراصل مجھے میری والدہ نے ہی دلائی ہے۔ بچپن میں مجھے عادت تھی کہ میں سکول جاتا تو کسی لڑکے کی پنسل یا دوات چُرا لاتا اور گھر آ کر والدہ کو دے دیتا۔ جب پنسل اور دوات کے مالک گھر آتے تو بجائے اِس کے کہ وہ مجھے ڈانٹتی اُلٹا آنے والوں سے لڑنا شروع کر دیتی اور کہتی کہ میرا بچہ چور نہیں حالانکہ اسے علم ہوتا تھا کہ میں وہ چیزیں چُرا کر لایا ہوں۔ اِس پر میں دلیر ہو گیا اور بڑی بڑی چوریاں شروع کر دیں لیکن میری والدہ ان پر بھی پردہ ڈالتی رہی۔ پھر میں نے چوروں کی صحبت اختیار کی اور گھروں کو لُوٹنا شروع کیا لیکن اُس وقت بھی میری والدہ کو خیال نہ آیا کہ وہ مجھے منع کرے۔ وہ ہر دفعہ میرے قصور کو چھپانے کی کوشش کرتی اور اگر کوئی شخص آ کر پوچھتا تو اُس سے لڑتی اور کہتی کہ میرا لڑکا چور نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک چوری کے دوران میں لڑائی ہو گئی اور مجھ سے ایک شخص قتل ہو گیا جس کی پاداش میں آج مجھے پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے۔ اگر میری والدہ شروع میں ہی مجھے چوری سے باز رکھتی اور میری چوریوں پر پردہ نہ ڈالتی تو مجھے بڑی چوریوں کے لیے دلیری نہ ہوتی اور مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

پس حقیقت یہی ہے کہ ماں باپ کی تربیت بچوں پر بڑا گہرا اثر ڈالتی ہے۔ جن بچوں کے والدین بچپن سے ہی اُن کے کانوں میں یہ بات ڈالتے رہتے ہیں کہ انہوں نے

بڑے ہو کر دین کی خدمت کرنی ہے وہ دینی ماحول سے الگ ہو کر بھی اس بات کو بھلاتے نہیں بلکہ اسے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔

چند دن ہوئے شیخوپورہ کے ایک افسر نے جنھوں نے بی۔سی۔جی کا کورس مکمل کیا ہوا ہے مجھے خط لکھا کہ میں دین کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا بہت اچھا! ہم غور کریں گے کہ آپ کی خدمات سے سلسلہ کس رنگ میں فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ کا کس خاندان سے تعلق ہے؟ انہوں نے کہا آپ نے صوفی عبدالخالق صاحب جالندھر والوں کا نام سنا ہوگا۔ میں نے کہا میں خوب جانتا ہوں۔ وہ جالندھر کے مشہور پیر تھے اور ان کی ایک بیٹی قادیان آیا کرتی تھی۔انہوں نے کہا وہ میری والدہ ہی تھیں۔میرے نانا تو احمدیت کے سخت مخالف تھے لیکن میری والدہ نے آخری عمر میں احمدیت قبول کر لی تھی اور فوت ہونے کے بعد وہ بہشتی مقبرہ قادیان میں دفن ہوئی ہیں۔ پھر انہوں نے لکھا مجھے زندگی وقف کرنے کی تحریک اس لیے ہوئی ہے کہ جب میں پیدا ہوا تھا اُس وقت سے میری والدہ نے میرے کانوں میں یہ بات ڈالنی شروع کی تھی کہ میں نے تمہاری زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کرنی ہے۔ میں چار پانچ سال کا ہی تھا کہ وہ فوت ہوگئیں لیکن اُن کی وہ بات میرے دل میں ایسی گڑی ہے کہ اب جبکہ میں بڑا ہو گیا ہوں میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی ہے اور بی۔سی۔جی کا ڈپلومہ بھی حاصل کر لیا ہے۔ میرے دل میں ہمیشہ یہ خلش رہتی ہے کہ میری والدہ نے تو یہ خواہش کی تھی کہ میں دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کروں لیکن میں دنیا کے کاموں میں مشغول ہوں۔ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے اِس بات کا ذکر اپنے والد سے بھی کیا تھا۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ جب تمہاری والدہ کی یہ خواہش تھی کہ تم دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرو تو تم زندگی وقف کر دو۔ اب دیکھو! ماں فوت ہوگئی۔ اُس کا بیٹا دوسرے ماحول میں چلا گیا۔ اُس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بی۔سی۔جی کا ڈپلومہ حاصل کیا اور اب اُسے ایک اچھی ملازمت ملی ہوئی ہے۔لیکن پھر بھی اُس کے دل میں یہ جلن رہتی ہے کہ میری ماں کہتی تھی کہ میں نے تمہیں دین کی خدمت کے لیے وقف کرنا ہے لیکن میں دنیا کمانے میں لگا ہوا ہوں۔

پس ماں باپ کی باتیں بڑا اثر پیدا کرتی ہیں اور اُن کی عدم توجہی کے نتیجہ میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن توجہ بھی اُسی وقت اثر کرتی ہے جب ماں باپ کو کسی عارضی جوش کے نتیجہ میں دین کی خدمت کا احساس نہ ہوا ہو بلکہ مستقل طور پر یہ فرض انہیں بے چین رکھتا ہو اور وہ ہمیشہ اپنی اولاد کو اس طرف توجہ دلاتے رہتے ہوں۔ ورنہ جو ماں باپ صرف وقتی جوش کے نتیجہ میں اس طرف توجہ کرتے ہیں وہ بعد میں نہ صرف اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے بلکہ اُن کی اولاد میں بھی دین کی خدمت کا احساس نہیں رہتا۔ میں نے عموماً دیکھا ہے کہ جب کسی کا چھوٹا بچہ شدید بیمار ہو جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ! تُو اسے شفا دے دے۔ اگر تُو اپنے فضل سے اُسے شفا دے دے گا تو میں اسے دین کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گا۔ مگر جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو انہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے کیا عہد کیا تھا اور وہ اسے دنیا کے کاموں پر لگا دیتے ہیں۔ اِسی طرح بعض والدین مجھے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہمارے سب بچے دین کے لیے وقف ہیں مگر جب وہ بچے جوان ہو جاتے ہیں تو انہیں دنیوی کاموں پر لگا دیتے ہیں۔ میں شمار کرنے لگوں تو باوجود اِس کے کہ بیماری کی وجہ سے میرا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اب بھی میں بیس پچیس آدمیوں کا نام لے سکتا ہوں جنہوں نے اپنے بچوں کو دین کی خدمت کے لیے وقف کیا تھا لیکن اب وہ سب کے سب دنیا کمانے میں لگے ہوئے ہیں اور انہیں یاد ہی نہیں آتا کہ کسی وقت انہوں نے اپنے سب بچوں کو دین کی خدمت کے لیے وقف کیا تھا۔ پھر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہتے ہیں حضور! ہمارے دو بچے ہیں اور وہ دونوں وقف ہیں۔ لیکن جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں اور دین کی خدمت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو اُن کا خط آ جاتا ہے کہ ہم نے اپنے دو بچوں کو وقف کیا تھا لیکن ان میں سے جو کچھ ہوشیار ہے وہ تو ہماری بات ہی نہیں مانتا۔ اور جو ہوشیار نہیں وہ ہماری بات تو مانتا ہے لیکن چونکہ اس کی صحت کمزور ہے اِس لیے اُس کی زندگی وقف کرنے کا بظاہر کوئی فائدہ نہیں۔ پھر سالہا سال گزر جاتے ہیں نہ اُن کا ہوشیار لڑکا دین کی خدمت کے لیے آگے آتا ہے اور نہ کمزور کو دین کی خدمت میں لگایا جاتا ہے۔

ان کا یہ طریقِ عمل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے لطیفہ مشہور ہے کہ کوئی پٹھان تھا۔ وہ ایک

کھجور کے درخت پر چڑھ گیا۔ کھجور کا درخت ستّر اسّی فٹ اونچا ہوتا ہے اور پھر اس کی کوئی شاخ بھی نہیں ہوتی کہ اُس کا سہارا لے کر اُس پر چڑھا جا سکے یا اُس سے اُترا جا سکے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اُس پر چڑھ تو گیا لیکن جب اُس نے نیچے دیکھا تو ڈر گیا اور اس نے سمجھا کہ اگر میں گر گیا تو میری ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی۔ اِس پر کہنے لگا کہ اے خدا! اگر تُو مجھے بحفاظت نیچے اُترنے کی توفیق دے دے تو میں ایک اونٹ کی قربانی کروں گا۔ اور یہ کہہ کر اُس نے نیچے اُترنا شروع کیا۔ جب وہ ایک تہائی کے قریب نیچے اُتر آیا تو اتفاقاً وہاں کوئی چھوٹی سی شاخ تھی۔ اُس پر سہارا لے کر پھر اُس نے نیچے کی طرف دیکھا تو زمین اب قریب تھی اور اُسے پہلے کی طرح بھیانک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اُس کا ڈر کچھ کم ہوا تو کہنے لگا اِتنے فاصلے کے لیے اونٹ کی قربانی تو بہت زیادہ ہے۔ اگر میں نیچے چلا گیا تو بطور شکرانہ ایک گائے ضرور قربان کروں گا۔ اور پھر اُترنا شروع کیا۔ جب وہ ایک تہائی فاصلہ اَور نیچے آ گیا تو اُس نے زمین کی طرف دیکھا۔ اب زمین اُسے پہلے سے بھی زیادہ قریب دکھائی دی اور اُس نے خیال کیا کہ گائے کی قربانی تو بہت زیادہ ہے۔ اگر میں نیچے پہنچ جاؤں تو ایک بکری کی قربانی تو ضرور کروں گا اور پھر اُترنا شروع کیا۔ جب وہ زمین سے صرف تین چار گز کے فاصلہ پر آ گیا تو کہنے لگا اتنے فاصلہ کے لیے ایک بکری کی قربانی بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر نیچے پہنچ گیا تو ایک مرغی کی قربانی ضرور کروں گا۔ جب وہ ایک دو گز اَور نیچے آ گیا تو اُسے مرغی کی قربانی بھی بڑی معلوم ہوئی اور کہنے لگا مرغی نہ سہی ایک انڈا تو خداتعالیٰ کی راہ میں دے ہی دوں گا۔ جب وہ زمین پر پہنچ گیا تو اُس نے اپنی شلوار میں سے ایک جُوں نکالی اور اُسے مار کر کہنے لگا جان کے بدلے جان۔ چلو! قربانی ہو گئی۔

یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو اپنے بچوں کو چھوٹی عمر میں تو وقف کر دیتے ہیں لیکن اگر ان میں سے کوئی ہوشیار ہو تو کہہ دیتے ہیں یہ تو ہماری بات نہیں مانتا، دوسرے بچہ کو وقف کر دیں گے۔ لیکن پھر دوسرے کے متعلق خط آ جاتا ہے کہ اس کی صحت کمزور ہے اس کے وقف کا کوئی فائدہ نہیں۔ کئی لوگ ایسے ہیں جن کے چھ چھ بچے تھے اور انہوں نے کہا کہ یہ چھ کے چھ بچے دین کی خدمت کے لیے وقف ہیں لیکن اب وہ چھ کے چھ دنیا کے کاموں میں

لگے ہوئے ہیں۔

پس اس دوست کی یہ بات بالکل درست ہے کہ والدین کو چاہیے کہ وہ بچپن سے ہی اپنے بچوں کے دلوں میں یہ بات ڈالنا شروع کر دیں کہ بڑے ہو کر انہوں نے دین کی خدمت کرنی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کام میں عورتیں بہت مدد دے سکتی ہیں۔ اس وقت مسجد میں عورتیں بھی بیٹھی ہیں۔ میں انہیں بھی توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں اور بچپن سے ہی بچوں کے کانوں میں یہ ڈالنا شروع کر دیں کہ بڑے ہو کر انہوں نے دین کی خدمت کرنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے ہو کر انہیں دین کی خدمت کا احساس رہے گا۔

کچھ عرصہ ہوا کالج کی ایک سٹوڈنٹ ہمارے گھر آئی اور اس نے مجھے ایک رُقعہ دیا جس میں لکھا تھا کہ میں دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا بی بی! لڑکیاں زندگی وقف نہیں کرسکتیں کیونکہ واقفِ زندگی کو تبلیغ کے لیے گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے بلکہ بعض دفعہ اُسے ملک سے بھی باہر جانا پڑتا ہے اور لڑکیاں اکیلی باہر نہیں جاسکتیں۔ ہاں! اگر تم زندگی وقف کرنا چاہتی ہو تو کسی واقفِ زندگی نوجوان سے شادی کر لو۔ وہ خاموش ہو کر چلی گئی۔ میری بیوی کی ایک ہم جماعت کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ کہنے لگی میں نے اس سے پہلے کی نیت کی ہوئی تھی کہ میں اپنی زندگی دین کے لیے وقف کروں گی لیکن اس نے پہل کر لی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کیے کہ اس کی شادی ایک غیرملکی واقفِ زندگی نوجوان سے ہوگئی۔ اب دیکھو! نیک نیتی کیسے اچھے پھل لاتی ہے۔

پھر ایک دن ایک اَور لڑکی روتی ہوئی میرے پاس آئی اور اُس نے کہا کہ میں کسی واقفِ زندگی نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن میرے والد اِس میں روک بنتے ہیں اور وہ میری شادی واقفِ زندگی سے نہیں کرنا چاہتے۔ میں حیران ہوا کہ اس کے اندر کس قسم کا اخلاص پایا جاتا ہے۔ میں نے مولوی ابوالعطاء صاحب کو کہا کہ وہ اس کے والد کو سمجھائیں۔ آخر چند دنوں کے بعد وہ پھر آئی اور اس نے کہا کہ میرا والد ایک واقفِ زندگی سے میری شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اُس کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد وہ پھر ایک دن روتی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرا باپ کہتا ہے کہ اگر تُو اپنے خاوند کے ساتھ ملک سے

باہر گئی تو میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھوں گا۔ میں نے کہا میں بیمار ہوں۔ تمہارے رونے کی وجہ سے میرا دل گھبراتا ہے۔ اس لیے تم خود ہی کچھ کرو اور اپنے والد کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لو۔ بعد میں مَیں نے پھر مولوی ابوالعطاء صاحب سے کہا اور انہوں نے کوشش کر کے سمجھوتا کرا دیا۔

اب دیکھو! وقفِ زندگی ایک جہاد ہے اور جہاد کا عورتوں کو براہِ راست حکم نہیں۔ واقفِ زندگی نوجوانوں کو غیر ممالک میں جانا پڑتا ہے اور لڑکیاں اکیلی باہر نہیں جا سکتیں۔ اس لیے اس قسم کی قربانی کا انہیں براہِ راست حکم نہیں۔ لیکن جب لڑکیوں میں دین کی خدمت کا جوش پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُن کے لیے ایسے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ ان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ ماں باپ بچپن سے ہی اپنی اولاد کے کانوں میں یہ بات ڈالنی شروع کر دیں کہ انہوں نے بڑے ہو کر دین کی خدمت کرنی ہے۔ اور پھر اگر اپنے بچوں کو وقف کرنے کا عہد کریں تو اُن لوگوں کی طرح نہ بنیں جو شروع شروع میں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سب بچے دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیئے ہیں لیکن جب عملی طور پر وقف کا سوال پیدا ہوتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کبھی انہوں نے وقف کا نام ہی نہیں لیا تھا۔

پھر ایک دوست نے لکھا ہے کہ جماعت کے احباب کو توجہ دلائی جائے کہ وہ واقفینِ زندگی کی قدر کیا کریں اور یہ سمجھیں کہ دین کا خادم ہونا نہایت اعلیٰ اور قابلِ قدر مقام ہے اور اس کی جتنی بھی عزت کی جائے کم ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک نہایت ضروری امر ہے اور جماعت کے دوستوں کو اِس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اس غرض کے لیے جماعت میں یہ طریق جاری کیا گیا ہے کہ جو واقفِ زندگی تبلیغ کے لیے باہر جاتا ہے یا ایک وقت تک کام کرنے کے بعد واپس آتا ہے اُسے الوداع یا خوش آمدید کہنے کے لیے کثرت سے لوگ اسٹیشن پر جاتے ہیں اور اُس کا اعزاز کرتے ہیں۔ لیکن اِس طرف بھی پوری توجہ نہیں۔ میرے نزدیک واقفینِ زندگی کے اعزاز کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ باہر جائیں تو ہزاروں کی تعداد میں جماعت کے دوست انہیں الوداع کہنے جائیں اور جب وہ واپس آئیں تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ انہیں خوش آمدید کہنے جائیں۔ ایک طرف مردوں کا ہجوم ہو اور دوسری طرف عورتیں گروہ در گروہ کھڑی ہوں تا کہ دوسروں کو بھی خیال آئے کہ کاش! ان کے بچے بھی

تبلیغ کے لیے باہر جاتے اور وہ بھی اِس قسم کی خوشی کا دن دیکھتے۔ اِسی طرح دوسری جماعتوں کو بھی اس کام میں حصہ لینا چاہیے۔ مثلاً لاہور، شیخوپورہ، لائلپور یا کسی دوسرے اسٹیشن پر گاڑی پہنچے تو وہاں کی جماعتیں الوداع یا خوش آمدید کہنے کے لیے بڑی بھاری تعداد میں اسٹیشن پر پہنچا کریں بلکہ جماعت کے دوستوں کو چاہیے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنے غیر احمدی دوستوں کو بھی ساتھ لایا کریں کیونکہ اس طرح بھی اُنہیں تبلیغ ہو جاتی ہے۔

اِس کے ساتھ ہی میں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر جماعت واقفین کی قدر نہیں کرتی تو اس میں ایک حد تک نقص واقفینِ زندگی کا بھی ہے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ سارے کام صرف مسائلِ دینیہ سیکھ لینے سے ہی نہیں ہوتے بلکہ انہیں اپنے اندر کچھ نہ کچھ انتظامی قابلیت بھی پیدا کرنی چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو۔ جب آپ کسی صحابی کو کسی کام کے لیے مقرر فرماتے تھے تو آپ اُس کی انتظامی قابلیت کو بھی دیکھتے تھے۔ آپ کے پاس بڑے بڑے عالم صحابہ بھی ہوتے لیکن آپ اُس عہدہ پر اُسی شخص کو مقرر فرماتے جو چاہے علمی قابلیت کے لحاظ سے دوسروں سے کم ہی ہو لیکن اس میں انتظامی قابلیت پائی جاتی ہو۔ ہمارے مبلغین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے اندر انتظامی قابلیت پیدا کریں تا انہیں ضرورت کے وقت اُن کاموں پر بھی لگایا جا سکے۔ سلسلہ کو صرف مبلغین کی ہی ضرورت نہیں بلکہ ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو انتظامی کام سنبھال سکیں۔ مثلاً اِس وقت نو کے قریب ناظر ہیں، نو کے قریب وکیل ہیں اور اٹھارہ کے قریب نائب ناظر اور نائب وکیل ہیں۔ چھتیس تو یہی بن گئے۔ اگر انتظامی قابلیت رکھنے والے لوگ ہمیں میسر نہ آئیں تو اِس تعداد کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر واقفین علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر انتظامی قابلیت بھی پیدا کریں، غیر ملکی زبانیں سیکھیں، ان میں مختلف مضامین پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کریں اور اچھی اور مفید باتوں کو اخذ کرنے کی کوشش کریں تو مرکز کے انتظامی عُہدوں پر بھی انہیں لگایا جاسکتا ہے۔

عیسائیوں کو دیکھ لو اُن میں اکثر انتظامی عُہدے پادریوں کے ہی سپرد ہوتے ہیں۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کی تعلیم کا معیار بھی وہی ہوتا ہے جو انتظامی محکموں میں

کام کرنے والے عہدیداروں کا ہوتا ہے۔ یورپ کی تاریخ پڑھو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ پرانی حکومتوں میں وزیراعظم، وزیرِ جنگ اور وزیرِ خزانہ کے عُہدوں پر پادری ہی مقرر کیے جاتے تھے۔ جب فرانس کی طاقت پورے جوبن پر تھی اُس کا وزیرِ خزانہ ایک پادری تھا۔ جب بھی مالی لحاظ سے بادشاہ کو کوئی دِقّت پیش آتی وزیرِ خزانہ اُسے دور کرتا تھا اور مشکلات کو دور کرنے کی وہ کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتا تھا۔ اِسی طرح اَور بھی کئی بادشاہ گزرے ہیں جن کی حکومتوں کے نظم و نسق میں پادریوں کو خاص دخل حاصل تھا۔ جب انتظامی محکموں کے افسر فیل ہو جاتے تھے تو پادری حکومت کو قائم رکھنے میں مدد دیتے تھے۔ پس اگر واقفین اپنے اندر انتظامی قابلیت پیدا کر لیں تو اِس کی وجہ سے جماعت میں ان کا اعزاز خود بخود بڑھ جائے گا۔

انگلستان کے عیسائی اگرچہ پروٹسٹنٹ ہیں کیتھولک نہیں لیکن پھر بھی وہاں پادریوں کے اثر کی یہ کیفیت ہے کہ ایڈورڈ ہشتم نے جب ایک مطلقہ عورت سے شادی کا ارادہ کیا تو گو وہ عورت پہلے بھی شاہی دعوتوں میں شریک ہوا کرتی تھی اور سب کو اس کا علم تھا لیکن پادریوں نے اس پر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ یہ بات چرچ کے دستور کے خلاف ہے۔ ان پادریوں کا اِتنا اثر تھا کہ باوجود اِس کے کہ مسٹر چرچل بادشاہ کی تائید میں تھے، تمام وزراء نے یہ نوٹس دے دیا کہ اگر بادشاہ نے اس عورت سے شادی کی تو ہم استعفٰی دے دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اِس بات پر مجبور ہو گیا کہ تخت کو چھوڑ دے۔ حالانکہ وہ اپنی رعایا کو انتہائی محبوب تھا۔

پس ہمارے مبلغین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے اندر انتظامی قابلیت پیدا کریں تا کہ انہیں مرکز ی عُہدوں پر لگایا جا سکے۔ اگر ان میں قابلیت پیدا ہو جائے تو جب انہیں ناظر یا نائب ناظر کے عُہدہ پر مقرر کیا جائے گا تو وہ بڑے بڑے وزراء کو بھی بے دھڑک مل سکیں گے۔ اِسی طرح انہیں اخبارات کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے لیکن دوسروں سے خریدے ہوئے اخبارات نہ ہوں بلکہ قربانی کر کے خود اخبارات خریدا کریں اور اُن کا مطالعہ کیا کریں۔ یہ نہیں کہ دفتر گئے اور وہاں اخبار پڑی دیکھی تو اُس کو پڑھنا شروع کر دیا۔ انہیں چاہیے کہ خواہ کتنا ہی تنگ گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے اخبار خود خرید کر پڑھیں۔ میں اپنے بچپن کے زمانہ میں بھی

اخبار خود خریدا کرتا تھا۔ حالانکہ اُس وقت مجھے صرف تین روپیہ ماہوار جیب خرچ ملا کرتا تھا۔ مجھے انگریزی زبان سے دلچسپی بھی انہی اخبارات کے مطالعہ کی وجہ سے ہوئی۔ میں اپنا سارا جیب خرچ اخبارات خریدنے میں لگا دیتا تھا کیونکہ مجھے اپنی معلومات کو وسیع کرنے کا شوق تھا۔ ان دنوں سکول میں اخبارات آتے تھے اور میرے لیے ممکن تھا کہ میں وہاں جا کر اُن کا مطالعہ کر سکوں۔ لیکن میری غیرت برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ میں دوسری جگہ سے اخبارات لے کر پڑھوں۔ پس واقفین کو چاہیے کہ وہ خود اخبارات خریدیں اور اُن کا مطالعہ کریں تا کہ ان کی معلومات وسیع ہوں۔ انہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اخراجات کہاں سے لائیں گے انہیں معمولی گزارہ ملتا ہے۔ بلکہ انہیں کسی نہ کسی طرح اخبارات کے لیے اخراجات مہیا کرنے چاہییں۔ مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کپڑے دھوبی سے نہ دھلوائیں بلکہ خود دھولیں اور جو رقم بچے اُس سے کوئی اخبار خرید لیں۔ اِسی طرح انہیں انتظامی کاموں کی اہلیت پیدا کرنی چاہیے تا کہ جب انہیں ایسے عُہدوں پر مقرر کیا جائے وہ اپنے کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔

درد صاحب کو دیکھ لو جب وہ مرکز میں خدمت کے لیے آئے تو اُن کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی مگر اُس وقت بھی وہ سلسلہ کے کاموں کے لیے بڑے بڑے سرکاری افسروں حتّٰی کہ وزراء کو بھی بے دھڑک مل لیتے تھے۔ اور اب بعض لوگ ایسے ہیں جو پینتالیس پینتالیس سال کے ہیں اور درد صاحب سے تعلیم میں بھی زیادہ ہیں لیکن انہیں کسی افسر سے ملنے کے لیے بھیجا جائے تو اول تو وہ افسر کی ملاقات سے پہلے ہی کانپنے لگ جاتے ہیں اور پھر اوٹ پٹانگ باتیں کر کے آ جاتے ہیں۔ حالانکہ احراری علماء نے بھی اس قسم کی قابلیت اپنے اندر پیدا کر لی تھی کہ خواجہ ناظم الدین صاحب اُن سے ملا کرتے تھے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے واقفین اپنے اندر قابلیت پیدا نہ کریں۔ اگر واقفین اپنے اندر یہ قابلیت پیدا کر لیں تو جماعت کے دوست خود بخود ان کا اعزاز کرنے لگ جائیں گے۔ پس اگر واقفین چاہتے ہیں کہ ان کا جماعت میں اعزاز ہو تو انہیں بھی اِس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ انہیں موجودہ سیاست اور تنظیم سے واقفیت پیدا کرنی چاہیے۔

پچھلے سال جو مجھے بیماری کا حملہ ہوا وہ صرف اِس وجہ سے ہوا کہ میں نے بجٹ کی

تیاری کے سلسلہ میں بہت زیادہ محنت کی تھی۔ اِس دفعہ پھر تحریک جدید کے وکیل اعلیٰ میرے پاس آئے اور کہا کہ بجٹ کی تیاری کے سلسلہ میں جو مشکلات ہیں اُن کے دور کرنے میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔ حالانکہ وہ خود مالیات کے ماہر ہیں اور گورنمنٹ کے سیکرٹری رہے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ میں بیماری کی وجہ سے مجبور ہوں میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔آپ قریشی عبدالرشید صاحب کو ساتھ لے لیں اور بجٹ پر غور کر کے ان مشکلات کا حل تلاش کر لیں۔ چنانچہ وہ واپس چلے گئے اور قریشی عبدالرشید صاحب سے مل کر انہوں نے بجٹ پر غور کیا اور آخر تمام مشکلات حل ہو گئیں۔اِسی طرح صدرانجمن احمدیہ میں اختر صاحب آئے۔ انہیں سرکاری ملازمت کا تجربہ تھا۔ انہوں نے چند نوجوانوں سے مل کر عملہ میں کانٹ چھانٹ شروع کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے اخراجات کم ہو گئے۔ پس اگر نوجوان اپنے اندر انتظامی قابلیت پیدا کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کا جماعت میں اعزاز نہ ہو اور انہیں مرکز میں اہم عُہدوں پر نہ لگایا جائے۔

اِس کے علاوہ خود واقفین کو بھی اپنے وقار اور عزتِ نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ میں کسی دوسرے ملک میں جا رہا تھا کہ مجھے ایک عالم نے کہا کہ مانگنا تو بُری بات ہے لیکن اگر آپ میرے لیے کوئی تحفہ لانا چاہیں تو فلاں چیز لے آئیں۔ حالانکہ ہمیں تو غیرت کا ایسا نمونہ دکھانا چاہیے کہ اگر کسی وقت ہمارے منہ سے غلطی سے ایسی بات نکل بھی جائے اور دوسرا ہمارے لیے کوئی چیز لے آئے تب بھی ہم وہ چیز قبول نہ کریں اور کہیں کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی کہ میں نے آپ سے اس کا ذکر کر دیا۔ اب آپ یہ چیز کسی دوسرے کو دے دیں۔میں یہ لینے کے لیے تیار نہیں۔ اور اگر پھر بھی وہ دینے پر اصرار کرے تو اُسے اس کی قیمت ادا کر دی جائے۔

میرے ساتھ حال ہی میں یہ واقعہ ہوا ہے کہ ہمارے ایک دوست بجلی کا پنکھا لینے کے لیے گئے۔ وہاں کوئی شخص ایک خاص قسم کے پنکھے کا آرڈر دے رہا تھا۔ ہمارے اِس دوست کے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ میں یہ پنکھا اپنے پیر کے لیے بنوا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا میرے پیر کے لیے بھی ایک پنکھا بنوا دیں۔ چنانچہ وہ ایک پنکھا بنوا کر

میرے پاس لے آئے۔ میں نے انہیں کہا اسے فوراً واپس کر دو کیونکہ تم نے خود مانگا ہے اور سوال کر کے میری بے عزتی کی ہے۔ میں اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔

پس اگر تم میں سے کسی کے پاس کوئی کپڑا نہیں، کوٹ نہیں اور کسی دوست سے بات کرتے ہوئے تمہارے منہ سے نکل جاتا ہے کہ میرے لیے فلاں چیز لیتے آنا اور وہ لے آئے تو تم اُسے کہو یہ کسی اَور کو دے دو کیونکہ میرے منہ سے غلطی سے ایسی بات نکل گئی تھی۔ یہ سوال ہے اور سوال کرنا منع ہے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یقیناً اُس کی عزت بڑھے گی اور لوگ اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیں گے۔

اس دوست نے اس بات کی کہ واقفین کو جماعت میں بنظرِ استحسان نہیں دیکھا جاتا ایک مثال یہ دی ہے کہ انہیں کوئی لڑکی نہیں دیتا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ میری یہ عادت نہیں کہ میں کسی کا نام لے کر بات کروں لیکن جہاں اِس کے بغیر چارہ نہ ہو وہاں مجبوری ہوتی ہے۔ میرے نزدیک ہماری جماعت میں ایسی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ معززینِ جماعت نے واقفین کو اپنی لڑکیاں دیں۔ مثلاً ہمارے ایک مبلغ عبدالحی صاحب ہیں۔ وہ صرف میٹرک پاس ہیں۔ انہیں جماعت کے ایک ڈاکٹر نے جن کی پریکٹس ڈیڑھ دو ہزار روپیہ ماہوار کی ہے اپنی لڑکی کا رشتہ دے دیا۔ لیکن عبدالحی صاحب نے اُسے طلاق دے دی۔ پھر ہم نے وہاں ایک اَور مبلغ بھیجا تو باوجود اِس کے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس لڑکی کی وجہ سے صدمہ پہنچ چکا تھا انہوں نے اس لڑکی کا نکاح پھر نئے مبلغ سے کر دیا۔ گویا انہوں نے اپنی لڑکی کی دو دفعہ شادی کی اور دونوں دفعہ واقفینِ زندگی سے کی حالانکہ اُن کے پہلے داماد نے اِس بات کا خیال تک نہ کیا کہ اگر میں واقفِ زندگی ہوں اور مجھ میں کوئی خوبی ہے تو وہ خداتعالیٰ کی نظر میں ہے۔ یہ شخص دنیوی لحاظ سے نہایت معزز ہے اور ڈیڑھ دو ہزار روپیہ ماہوار پریکٹس کے ذریعہ کما لیتا ہے۔ اس نے اگر مجھے محض واقفِ زندگی ہونے کی وجہ سے لڑکی دے دی ہے تو مجھے اِس کی قدر کرنی چاہیے۔

پھر ایک اَور واقفِ زندگی ہے اُس کے لیے پانچ سات رشتے تلاش کیے گئے لیکن اُس نے ہر دفعہ انکار کر دیا اور کہا کہ میری بہن جہاں چاہے گی میرا رشتہ کرے گی اور اُس کی

بہن بھی وہی رشتے لاتی ہے جن کے متعلق ہمیں علم ہے کہ اُس نے پسند نہیں کرنے۔ پس واقفینِ زندگی کو بھی اپنی حیثیت دیکھنی چاہیے۔ بیشک ان میں دینی قابلیت پائی جاتی ہے لیکن انہیں اپنا معیار اتنا بلند بھی نہیں کر لینا چاہیے کہ کوئی کمشنر اپنی لڑکی انہیں دے تو وہ قبول کریں گے ورنہ نہیں۔ آخر وہ ایسا رنگ اپنے اندر کیوں پیدا نہیں کرتے جو خداتعالیٰ کو بھی پسند ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ مالدار شخص تھے اور انہوں نے اپنی لڑکی آپ کی خدمت میں پیش کر دی تھی لیکن آپؐ کی دوسری بیویاں اکثر ایسی ہی تھیں کہ ان میں سے کوئی مطلقہ تھی اور کوئی بیوہ تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کو برداشت کیا ہے یا نہیں؟ پھر واقفین کو کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں کہ انہیں کسی بڑے رئیس کی لڑکی ملے تو وہ شادی کریں گے ورنہ نہیں۔ اگر تم اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہو تو لڑکی والے اپنے آپ کو کیوں بڑا نہ سمجھیں۔ پس واقفین کو چاہیے کہ وہ ان باتوں کو ترک کر دیں اور جو چیز بھی خداتعالیٰ کی طرف سے ملے اُس کی قدر کریں۔

بہرحال یہ بات بالکل غلط ہے کہ واقفین کو رشتے نہیں ملتے۔ میرے باڈی گارڈوں کی تنخواہ پینسٹھ روپے ماہوار ہے۔ لیکن پچھلے چند دنوں میں ان میں سے پانچ کی شادیاں ہوئی ہیں۔ واقفین کو ان سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ مثلاً مبلغین کی تنخواہ پچھتر روپے سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہے۔ اگر پینسٹھ روپے ماہوار لینے والے کو رشتہ مل جاتا ہے تو انہیں کیوں نہیں مل سکتا؟ وجہ صرف یہی ہے کہ باڈی گارڈ تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہیں کسی شریف گھرانے کی لڑکی مل جائے تو کافی ہے لیکن واقفِ زندگی کہتا ہے کہ مجھے کوئی جرنیل یا گورنر جنرل لڑکی دے تب میں شادی کروں گا ورنہ نہیں۔ اور جب وہ اپنی قیمت حد سے زیادہ لگاتا ہے تو خداتعالیٰ بھی اسے ناکام کرتا ہے۔ پس جب باڈی گارڈوں کو بھی رشتے مل جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ واقفین کو رشتے نہ ملیں۔ کیونکہ ایک واقف کی حیثیت باڈی گارڈ سے بہت زیادہ ہے۔ وہ عربی کا گریجوایٹ ہوتا ہے اور اُس کا اعزاز باڈی گارڈ سے سَو گُنے زیادہ ہوتا ہے۔ پھر اس کی آمد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ باڈی گارڈ کی تنخواہ میں ترقی بھی ہو گی تو وہ پچھتر روپے سے زیادہ نہیں

بڑھے گی لیکن واقفین کی تنخواہیں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تک جا سکتی ہیں۔ پھر اگر ان میں سے کسی کا بیرونی مبلغ کے طور پر انتخاب ہو گیا یا مرکز میں ناظر یا نائب ناظر کے عُہدہ پر تقرر ہو گیا تو ان کی تنخواہ تین تین، چار چار سَو روپیہ تک بھی جا سکتی ہے۔ پس حقیقت یہی ہے کہ واقفین کو رشتے ملتے ہیں لیکن بعض اوقات وہ اپنی نادانی کی وجہ سے خود انہیں ردّ کر دیتے ہیں۔

پھر ایک دوست نے لکھا ہے کہ جماعت کے امراء کو تحریک کی جائے کہ وہ اپنے ایک ایک لڑکے کی زندگی دین کی خدمت کے لیے وقف کریں۔ اِس سے بھی جماعت میں واقفین کا اعزاز بڑھے گا اور نوجوانوں کو وقف کی تحریک ہو گی۔ اِس بات کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ جماعت میں مجھ سے زیادہ ادب اَور کس شخص کا ہے؟ میں نے اپنے سب بیٹوں کی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ اگر اِس سے واقفین کا اعزاز نہیں بڑھا اور جماعت کو وقف کی طرف توجہ نہیں ہوئی تو اَور کونسا احمدی ہے جو اپنا لڑکا دین کی خدمت کے لیے وقف کر دے تو جماعت میں واقفین کا اعزاز بڑھ جائے گا اور لوگوں کو وقف کی طرف توجہ پیدا ہو جائے گی۔

پھر ایک شخص نے اس بات کی تحریک کی ہے کہ عیسائیوں کی طرح تبلیغ کی خاطر ایسے نوجوانوں کو لیا جائے جو مجرّدانہ زندگی بسر کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر یہ جائز نہیں۔ اس لیے ہم اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ شادی کے بعد عورتیں بعض اوقات ایسے مطالبات کر دیتی ہیں جو مبلغ پورا نہیں کر سکتے اور اس کے نتیجہ میں ازدواجی زندگی تلخ ہو جاتی ہے لیکن ہم اِس تجویز پر عمل نہیں کر سکتے۔ اسلام نے تجرّد کی زندگی بسر کرنے سے منع کیا ہے [1] اور جس کام کو اسلام نے جائز قرار نہیں دیا اُسے ہم اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح جاری کر سکتے ہیں۔

پھر ایک دوست نے لکھا ہے کہ واقفین کو کوئی نہ کوئی فن سکھانا چاہیے۔ یہ بات نہایت معقول ہے۔ میں نے بعض واقفین کو زمیندارہ کام سکھانے کی ہدایت دی ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنے اندر قابلیت پیدا کر لی تو نہ صرف جماعت میں ان کا وقار بڑھے گا بلکہ یہ فن بھی ترقی کرے گا۔ جب انہیں جماعتوں میں

بھیجا جائے گا تو وہ تبلیغ کے ساتھ جماعت کے زمینداروں کی اقتصادی حالت کو بھی بہتر بنا سکیں گے۔ اسی طرح ڈرائیونگ کا پیشہ بہت مفید ہے۔ کالج والوں کو چاہیے کہ وہ ہر واقف کو ڈرائیونگ کا کام سکھا دیں۔ جن لوگوں کو شوق ہوتا ہے وہ بڑی آسانی سے یہ فن سیکھ لیتے ہیں۔ پھر ڈرائیونگ کا کام سکھانے کے بعد انہیں موٹر مکینک کا کام سکھانا چاہیے۔ غیرملکوں میں ڈرائیونگ کا کام جاننے والے کی بہت قدر ہوتی ہے۔ وہاں ڈرائیور ملنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی خود ڈرائیونگ جانتا ہو تو اُسے کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ یورپ کے سفر کے دوران میں مَیں نے ایک موٹر ڈرائیور سے دریافت کیا کہ یہاں گھروں میں کام کرنے والے ڈرائیوروں کی کیا تنخواہ ہے؟ تو اس نے بتایا کہ یہاں ان کی تنخواہیں نو سو روپیہ ماہوار تک ہیں۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ ٹیکسی ڈرائیوروں کی کیا تنخواہ ہے؟ تو اس نے بتایا ٹیکسی ڈرائیوروں کی تنخواہ پانچ سَو روپیہ ماہوار تک ہے۔ میں نے کہا گھر کے ڈرائیور کو تو دن میں کسی وقت ڈرائیونگ کرنی پڑتی ہے اور تمہیں سارا دن ڈرائیونگ کرنی پڑتی ہے۔ پھر تمہاری اور گھر کے ڈرائیوروں کی تنخواہوں میں اس قدر فرق کیوں ہے؟ تو اُس نے بتایا کہ ہمیں وقتاً فوقتاً انعام بھی ملتے رہتے ہیں اور انعاموں کو ملا کر ہماری تنخواہ ہزار روپے ماہوار سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن گھر کے ڈرائیور کو کوئی انعام نہیں ملتا۔ اس لیے اس کی تنخواہ ٹیکسی ڈرائیور سے زیادہ ہوتی ہے۔ پس ڈرائیونگ اور مستری کا کام بہت مفید پیشہ ہے اور کالج والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے طلباء کو ان پیشوں کی تعلیم دیں۔ ہمارے علماء نے پچھلے بزرگوں کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اُن میں عموماً یہ لکھا ہوتا ہے کہ فلاں بزرگ جو بہت بڑے عالم تھے اور دنیا کے کناروں سے لوگ اُن کے پاس آتے تھے موزوں کی مرمت کیا کرتے تھے یا جُوتیاں گانٹھ کر روزی کمایا کرتے تھے۔ فلاں بزرگ ٹوکریاں بنایا کرتے تھے۔ غرض ہر شخص کوئی نہ کوئی پیشہ جانتا تھا۔ اِس چیز کا اہلِ عرب پر اتنا اثر ہوا کہ آج تک وہ اپنے پیشے گِناتے ہیں۔ ان میں چاہے کوئی وزیرِاعظم ہو تب بھی وہ اپنے نام کے ساتھ اپنا پیشہ لگائے گا اور اُسے وہ بالکل بُرا نہیں سمجھے گا۔ پس طلباء کو مختلف پیشے سکھانے چاہییں۔ اسی طرح اگر علماء مختلف پیشے سیکھ لیں تو جماعت میں بھی ان پیشوں کی قدر ہو جائے گی۔

پھر ایک دوست نے لکھا ہے کہ عورتوں کو ڈاکٹری پڑھا کر اُن کی واقفینِ زندگی سے شادی کر دینی چاہیے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ واقفینِ زندگی کو جماعت میں بنظرِ استحسان نہیں دیکھا جاتا اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو ڈاکٹری پڑھا کر اُن کی واقفینِ زندگی سے شادی کر دینی چاہیے۔ اگر جماعت کے لوگ اپنی اَن پڑھ یا عام تعلیم یافتہ لڑکیاں بعض دوستوں کے خیال کے مطابق واقفینِ زندگی کو دینے پر تیار نہیں تو وہ ڈاکٹری پاس لڑکیاں اُن کے نکاح میں کیسے دے دیں گے؟ لیکن میں پھر کہوں گا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ جہاں جماعت کا فرض ہے کہ وہ واقفینِ زندگی کا اعزاز کرے وہاں واقفین کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے حالات کو دیکھیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ انہیں دے اُس پر قناعت کریں۔ یہ نہ سمجھیں کہ کسی جرنیل یا وزیر کی بیٹی ہی انہیں ملے گی تو شادی کریں گے ورنہ نہیں۔

پھر ایک دوست نے لکھا ہے کہ جماعت کے نوجوان مولوی کہلانے سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے وہ اس طرف نہیں آتے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے ہم نے اِس کا علاج کر دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کی ڈگری کا نام شاہد رکھ دیا ہے۔ وہ مولوی نہ کہلائیں شاہد کہلا لیں۔ لیکن اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ لوگوں کو مولوی کہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور اب اس عادت کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی اگر مولوی کہا جاتا تو آپ چڑ جایا کرتے تھے۔ مولوی محمد حسین بٹالوی آپؑ کو چڑانے کے لیے ہمیشہ مولوی غلام احمد کہا کرتا تھا جس پر آپؑ کو غصہ آ جاتا تھا اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کئی بار اسے کہا ہے کہ مجھے مولوی نہ لکھا کرو لیکن یہ مجھے چڑانے کے لیے ہمیشہ یہی لکھتا ہے کہ مولوی غلام احمد کی یہ بات ہے۔ مگر مولوی کہنے کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں کیونکہ دینی علوم کی طرف توجہ دلانے کے لیے مولوی کے سوا ہمارے پاس اَور کوئی لفظ نہیں۔ بہرحال ہم نے علماء کی ڈگری کا نام شاہد رکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی کسی حد تک مولویت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

پھر ایک دوست نے لکھا ہے کہ ایسے واقفینِ زندگی کو منتخب کیا جائے جو ساری عمر کے لیے باہر رہیں اور نہ صرف ساری عمر کے لیے باہر رہیں بلکہ اپنی جائیداد بھی جماعت کو

دے دیں۔ یہ بات بھی قابلِ عمل نہیں کیونکہ جو شخص اپنی زندگی وقف کرنے کے لیے تیار نہیں اُس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی جائیداد بھی وقف کر دے کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔

پھر ایک دوست نے لکھا ہے کہ کچھ عرصہ کے وقف کا دستور رائج کیا جائے مگر یہ بات بھی قابلِ عمل نہیں کیونکہ ایک واقفِ زندگی کے تیار کرنے پر بڑی بھاری رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ اگر تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کسی واقفِ زندگی کو صرف تین چار سال کے لیے رکھا جائے اور پھر اُسے فارغ کر دیا جائے تو اِس سے جماعت کو مالی نقصان پہنچے گا۔ اور نہ صرف جماعت کو مالی نقصان پہنچے گا بلکہ اُس واقفِ زندگی کو بھی نقصان پہنچے گا کیونکہ جب وہ تبلیغ سے واپس آئے گا تو اُس کی ملازمت والی عمر نہیں رہے گی۔ گویا کچھ عرصہ کے وقف کا طریق رائج کرنے سے نہ صرف سلسلہ کا روپیہ ضائع ہو گا بلکہ واقفِ زندگی بھی کسی سرکاری ملازمت کے حصول کے قابل نہیں رہے گا۔ پس یہ تجویز گو بظاہر ٹھیک نظر آتی ہے لیکن درحقیقت معقول نہیں۔

غرض یہ مختلف تجاویز ہیں جو میرے خطبات کے بعد باہر کے بعض احمدی دوستوں نے لکھی ہیں اور ان کے متعلق میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس شخص کی قسمت میں یہ لکھا ہو کہ وہ دین کی خدمت کرے گا اُسے اس کی توفیق مل جاتی ہے اور اگر اس خدمت میں اس کی جان بھی چلی جائے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ اسلامی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ حنین کے موقع پر جب ہزاروں تیر اندازوں نے تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی تو مسلمانوں کی سواریاں بدک کر میدانِ جنگ سے بھاگ پڑیں۔ درحقیقت اِس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب اسلامی لشکر روانہ ہوا تو مکہ والوں نے خواہش کی کہ چونکہ ہم حدیثُ العہد ہیں اور اس سے قبل کسی لڑائی میں شامل نہیں ہوئے اس لیے اس موقع پر ہمیں بھی قربانی پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور دو ہزار نَومسلم بھی اسلامی لشکر کے ساتھ چل پڑے۔ یہ لوگ کفار کے اچانک اور دو طرف حملہ کی برداشت نہ کر سکے اور واپس مکہ کی طرف بھاگے۔ صحابہؓ گو اِس قسم کی تکالیف اُٹھانے کے عادی تھے مگر جب دو ہزار گھوڑے اور اونٹ اُن کی صفوں میں سے

بے تحاشا بھاگتے ہوئے نکلے تو ان کے گھوڑے اور اونٹ بھی ڈر گئے اور سارے کا سارا لشکر بے تحاشا پیچھے کی طرف دوڑ پڑا۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صرف بارہ صحابی رہ گئے اور تین اطراف سے قریباً چار ہزار تیر انداز تیر برسا رہے تھے۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ ہماری سواریاں اِس قدر ڈر گئی تھیں کہ ہمارے ہاتھ باگیں موڑتے موڑتے زخمی ہو گئے۔ لیکن اونٹ اور گھوڑے واپس مُڑنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بعض دفعہ ہم باگیں اِس زور سے کھینچتے تھے کہ اونٹ یا گھوڑے کا سر اُس کی پیٹھ کو لگ جاتا مگر پھر جب ہم اُسے پیچھے کی طرف موڑتے تو وہ بجائے پیچھے مُڑنے کے اَور بھی تیزی کے ساتھ آگے کی طرف بھاگ پڑتا۔ اُس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو بلایا اور اُن سے فرمایا عباس! بلند آواز سے کہو کہ اے وہ لوگو جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر بیعتِ رضوان کی تھی اور اے وہ لوگو جو سورۃ بقرہ کے زمانہ کے مسلمان ہو! خداتعالیٰ کا رسول تمہیں بلاتا ہے۔ حضرت عباسؓ نے جب یہ آواز دی تو وہ صحابی کہتے ہیں کہ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ گویا ہم مر چکے ہیں، قیامت کا دن آ گیا ہے اور اسرافیل بگل بجا کر ہمیں بُلا رہا ہے۔ تب ہم میں سے جو اپنی سواریاں موڑ سکے انہوں نے اپنی سواریاں موڑ لیں اور جو سواریاں نہ موڑ سکے انہوں نے تلواروں سے اپنے اونٹوں اور گھوڑوں کی گردنیں کاٹ دیں اور خود دوڑتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ کہتے ہوئے چل پڑے کہ لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ۔ اے رسول اللہ! ہم حاضر ہیں۔ اے رسول اللہ! ہم حاضر ہیں اور چند منٹ میں ہزاروں کا لشکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد جمع ہو گیا۔2

دیکھو! صحابہؓ میں کس قدر جوش اور ایمان پایا جاتا تھا کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آواز پر کہ خداتعالیٰ کا رسول تمہیں بلاتا ہے اپنی سواریوں کی گردنیں کاٹ دیں اور دوڑتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے۔ اور انہوں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! ہم اسلام کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ پس جن لوگوں کی قسمت میں دین کی خدمت کرنا ہوتا ہے وہ خود بخود اس کے لیے آگے آ جاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی قسمت میں یہ نیکی نہیں انہیں نہ میرے خطبات کام دے سکتے ہیں، نہ دوسروں کی مثالیں انہیں

کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں انہیں دین کی خدمت کے لیے آگے لا سکتی ہیں اور نہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی باتیں انہیں اس طرف توجہ دلا سکتی ہیں۔ وہ ازلی محروم ہیں۔ ان کو برکت کون دے؟ برکت اُسی کو ملے گی جس کی قسمت میں وہ پہلے سے لکھی ہوئی ہے۔

ایک لطیفہ مشہور ہے کہ مرزا غالب کو آم بہت پسند تھے۔ ایک دن وہ بادشاہ کو ملنے گئے تو وہ انہیں اپنے باغ میں لے گیا۔ پرانے زمانہ میں درباریوں کو یہ ادب سکھایا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ بادشاہ کی طرف اپنا منہ رکھا کریں لیکن مرزا غالب باربار آموں کی طرف دیکھتے۔ بادشاہ نے کہا مرزا غالب! یہ کیا بات ہے تم باربار اُدھر کیوں دیکھتے ہو؟ انہوں نے کہا حضور! میں نے سنا ہوا ہے کہ جب خدا تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اِس دنیا میں بھیجتا ہے تو وہ رزق پر اُس کا نام لکھ دیتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ شاید کسی آم پر میرا یا میرے باپ دادا کا بھی نام لکھا ہوا ہو۔ بادشاہ ہنس پڑا اور اُس نے اپنے ایک نوکر کو حکم دیا کہ وہ مرزا غالب کے گھر آم دے آئے۔

پس جس کی قسمت میں خدا تعالیٰ نے دین کی خدمت لکھی ہے اُس کے راستہ میں خواہ دس میل تک زہریلے سانپ ہوں وہ انہیں کچلتا ہوا آگے آ جائے گا۔ اور خواہ ننگی تلواریں کھڑی ہوں اور اِس بات کا خوف ہو کہ اگر وہ آگے بڑھا تو اُس کی گردن کٹ جائے گی تب بھی وہ دین کی خدمت کے لیے آ جائے گا۔ بلکہ دین کی خدمت تو بڑی چیز ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ باطل کے ساتھ محبت رکھنے والے بھی کسی مصیبت کی پروا نہیں کرتے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کی بات ہے ایک میراثی کا لڑکا سِل کی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اُس کی ماں اُسے علاج کے لیے قادیان لائی۔ وہ لڑکا عیسائی ہو چکا تھا اور اُس کی والدہ کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح دوبارہ اسلام قبول کر لے۔ اُس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درخواست کی کہ آپ نہ صرف اِس کا علاج کریں بلکہ اسے تبلیغ بھی کریں تا کہ یہ دوبارہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ سمجھا۔ آخر ایک رات بیماری کی حالت میں ہی وہ بٹالہ کی طرف بھاگ نکلا

تا کہ وہاں عیسائیوں کے مرکز میں چلا جائے۔ اُس کی ماں کی آنکھ کھلی اور اُس نے چارپائی خالی دیکھی تو وہ رات کے اندھیرے میں اکیلی بٹالہ کی طرف دوڑ پڑی اور کئی میل کے فاصلہ سے اُسے پکڑ کر لے آئی۔ پھر وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور روتی ہوئی کہنے لگی حضور! میرا یہ اکلوتا بیٹا ہے۔ اگر یہ مر جائے تو مجھے اِس کی کوئی پروا نہیں۔ لیکن میری صرف اتنی خواہش ہے کہ جس طرح بھی ہو یہ مرنے سے پہلے دوبارہ کلمہ پڑھ لے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس عورت کے اخلاص کو دیکھ کر یہ فضل کیا کہ دو تین دن کے بعد اُس نے اسلام قبول کر لیا اور پھر وہ فوت ہو گیا۔ پس اگر باطل کے ساتھ محبت کرنے والے بھی بڑی بڑی قربانیاں کر سکتے ہیں تو دین کے ساتھ سچی محبت رکھنے والے کسی قسم کی قربانی سے کس طرح دریغ کر سکتے ہیں۔

بہرحال دوستوں نے جو باتیں لکھی ہیں اُن میں سے بعض بہت اچھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ واقفین کو کوئی نہ کوئی پیشہ سکھانا چاہیے اور پھر یہ کہ جماعت کے دوستوں کو چاہیے کہ وہ واقفین کا اعزاز کریں۔ مگر جیسا کہ میں نے بتایا ہے خود واقفین کے اندر انتظامی قابلیت ہونی چاہیے۔ اگر ان میں انتظامی قابلیت ہو گی تو انہیں مرکز میں ذمہ داری کے عُہدے مل سکیں گے۔ انگریزی دانوں سے ہماری کوئی دوستی نہیں اور نہ عربی والوں سے ہماری کوئی دشمنی ہے۔ اگر واقفین انتظامی قابلیت پیدا کر لیں تو درحقیقت مرکز کے سارے اہم عُہدے اُنہی کے لیے ہیں اور وہی اس کے اصل حق دار ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ لوگ دعا کریں کہ خداتعالیٰ آپ لوگوں کو سچا ایمان بخشے، آپ کے اندر دین کی خدمت کی خواہش پیدا کرے تا آپ اپنی جان اور مال سب کچھ اپنے خدا کے سامنے پیش کر دیں۔ اور جب مریں تو ایسی حالت میں مریں کہ آپ کے دلوں میں یہ حسرت نہ ہو کہ کاش! ہم دین کی خدمت کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں کو دور فرمائے اور ہماری خدمات کو قبول کرے اور حضرت ابوبکرؓ کی طرح ہمیں اس بات کی توفیق دے کہ تھوڑا یا بہت جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے وہ ہم اُس کی راہ میں قربان کر دیں۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالی قربانی کا مطالبہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ

اپنا سارا اثاثہ حتّٰی کہ لحاف اور چار پائیاں بھی اُٹھا کر لے آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سامان کو دیکھ کر فرمایا ابوبکر! کچھ گھر میں بھی چھوڑا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یَا رَسُولَ اللہ! میں نے گھر میں صرف خدا اور اُس کے رسول کا نام چھوڑا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے ہمیشہ یہ تڑپ رہتی تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح مالی قربانی میں حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں مگر میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اِس موقع پر میرے پاس اتفاقاً زیادہ مال تھا۔ میں نے کہا چلو! رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالبہ پر میں اِس مال کا نصف حصہ دے دیتا ہوں۔ چنانچہ میں نصف مال لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے سنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ سے دریافت فرما رہے تھے کہ ابوبکر! تم نے اپنے گھر میں بھی کچھ چھوڑا ہے؟ اور حضرت ابوبکرؓ جواب دے رہے تھے یَا رَسُولَ اللہ! میں گھر میں خدا اور اُس کے رسول کا نام چھوڑ کر آیا ہوں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جب میں نے یہ الفاظ سنے تو میں نے کہا یہ بڈھا نہیں ہارتا۔ میں کتنی قربانی بھی کروں یہ مجھ سے آگے نکل جاتا ہے۔3

پس اپنے لیے بھی اور باقی احمدیوں کے لیے بھی یہ دعا کرو کہ جب بھی دنیا چھوڑنے کا وقت آئے تم کہہ سکو کہ اے خدا! تُو نے ہمیں جو مال دیا تھا یا جان دی تھی ہم نے اسے تیرے رستہ میں قربان کر دیا ہے اور تیرے نام کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ اب تُو اپنے نام کی عزت کی وجہ سے ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں اپنا قُرب نصیب فرما"۔

خطبہ ثانیہ کے بعد حضور نے فرمایا:

"نمازِ جمعہ کے بعد میں بعض جنازے پڑھاؤں گا۔

(1) حکیم غلام حسین صاحب پاڑہ چنار فوت ہو گئے ہیں۔ حکیم صاحب پرانے احمدی تھے۔ درمیان میں انہیں ابتلا بھی آ گیا تھا لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں احمدیت کے قبول کرنے کی توفیق دے دی۔

(2) عذرا بیگم صاحبہ اہلیہ ایم عبدالرحمان صاحب ڈھاکہ فوت ہو گئی ہیں۔ انہوں نے نواب صاحب کے گھر میں ہی پرورش پائی تھی۔ ان کے والد افریقہ میں رہتے تھے۔

(3)منیر الدین صاحب واقفِ زندگی جامعۃ المبشرین کی اہلیہ کراچی میں اچانک فوت ہو گئی ہیں۔ پچھلے جلسہ پر یہاں آئی تھیں۔ بیچاری نہانے کے لیے بیٹھی تھیں کہ اچانک دل پر ایسا اثر پڑا کہ بیہوش ہو گئیں۔ انہیں اُٹھا کر باہر لایا گیا تو تھوڑی ہی دیر میں فوت ہو گئیں۔
(4)صوفی عبدالرحیم صاحب پراچہ فوت ہو گئے ہیں۔ آپ صوفی عبدالغفور صاحب مبلغ ہانگ کانگ کے بہنوئی تھے۔ 1924ء میں مولوی نعمت اللہ خاں صاحب کی شہادت کے موقع پر کابل میں موجود تھے۔ اس شہادت سے ہی متأثر ہو کر انہوں نے احمدیت قبول کی تھی۔
نماز کے بعد میں چاروں جنازے پڑھاؤں گا"۔

(الفضل 25مارچ1956ء)

---

1 : تفسیر روح البیان زیر آیت سورۃ الحدید 28(ثم قفینا علٰی اٰثارھم برسلنا وقفَّینا بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ وَاٰتیناہُ الْاِنْجِیْلَ ......الخ)
2 : سیرت ابن ہشام جلد4 صفحہ 87 مطبوعہ مصر 1936ء
3 : ترمذی ابواب المناقب باب رجاءہ ان یکون ابوبکر ممن یدعی من جمیع ابواب الجنۃ